عبادت کے بغیر ہماری کوئی زندگی نہیں

(خطبہ جمعہ فرمودہ ۱۵ / جولائی ۱۹۸۳ء بمقام مسجد اقصیٰ ربوہ)

تشہد وتعوذ اور سورۂ فاتحہ کے بعد حضور نے مندرجہ ذیل آیات کی تلاوت کی:

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ﴿۲۰﴾ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ﴿۲۱﴾ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ﴿۲۲﴾ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ﴿۲۳﴾ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴿۲۴﴾ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ﴿۲۵﴾ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿۲۷﴾ وَالَّذِينَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ﴿۲۸﴾ (المعارج: ۲۰-۲۹)

اور پھر فرمایا:

قرآن کریم کی تذکیر کے رنگ بھی بڑے نرالے، انوکھے اور بہت پیارے ہیں۔ انسانی فطرت کا کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں جس کی طرف توجہ دلا کر انسان کی اصلاح ممکن ہو اور قرآن کریم نے اس کی طرف توجہ نہ دلائی ہو۔ چنانچہ قرآن کریم انسانی فطرت کے بہت باریک اور لطیف نکتے اٹھاتا ہے اور انکی طرف انسان کی توجہ مبذول کرواتا ہے، انسان کو اپنی حقیقت اور کم مائیگی سے آگاہ کرتا ہے، اس کی حیثیت یاد کراتا ہے اور پھر اس کے لئے مایوسی کی بجائے امید کی نئی کھڑکیاں کھول دیتا ہے یعنی انسان جب اپنی حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہو کر مٹی ہو جاتا ہے تو پھر اسے اٹھاتا ہے اور اسے یہ بتاتا ہے کہ ہم تمہیں مایوس کرنے کے لئے یا ناکام اور نامراد بنانے کے لئے یہ باتیں نہیں بتا رہے

بلکہ تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنے کے بعد اور سچائی پر قائم کرنے کے بعد ابدی نجات کی راہ دکھانے کے لئے یہ باتیں بتا رہے ہیں۔ ہم تمہیں یہ بتاتے ہیں کہ کن باتوں سے بچنا ہے اور کس طرح بچنا ہے اور ہمیشہ کی فلاح کیسے پانی ہے۔ یہ راز ہے جو ہم تمہیں بتا رہے ہیں۔ یہ ہے قرآن کریم کی تذکیر کا انداز جو مختلف مواقع پر اختیار کیا گیا ہے لیکن اس کی بنیادی صفات وہی رہتی ہیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔

سورۃ المعارج کی یہ آیات جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں ان میں پہلی دو آیات میں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے دل دہلا دینے والی بات کی گئی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان کو اس کی حقیقت بتا کر یہ بتایا گیا ہے کہ تم تو کسی کام کی چیز نہیں ہو، تمہاری تو فطرت کے اندر بعض کجیاں موجود ہیں، تمہاری تخلیق اور بناوٹ میں بعض کمزوریاں پائی جاتی ہیں پھر بھی تم بڑے بڑے بول بولو اور اپنی ذات پر بنا کرتے ہوئے کسی ترقی کے خواب دیکھو تو یہ محض جھوٹ ہے، فرمایا اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا انسان تو پیدا ہی ایسی حالت میں کیا گیا ہے کہ وہ بے صبرا بھی ہے تُھڑ دِلا اور کم حوصلہ بھی ہے۔ یعنی اس کی تخلیق ہی ایسی ہے اور اس کے تُھڑ دِلا ہونے اس کے کم حوصلہ ہونے اور اس کے بے صبرا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا جب اسے کوئی شر پہنچتا ہے، کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو خوب شور ڈالتا ہے اور واویلا کرتا ہے اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ جیسے اس اندھیرے سے کبھی نکل ہی نہیں سکوں گا اس لئے بے انتہا بے قراری کا اظہار کرتا ہے۔ وَ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا لیکن جب اسے کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو وہ کنجوس بن جاتا ہے اور دوسروں تک اپنی بھلائی کو پہنچانے کا خیال بھی دل میں نہیں لاتا اور خود غرضی دکھاتا ہے۔

انسانی فطرت کی ان دو صفات میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ شر کے نتیجہ میں جَزُوْعًا کے بعد خیر کے نتیجہ میں مَنُوْعًا کی صفت کیوں رکھی گئی یعنی یہ کیوں فرمایا گیا کہ جب اسے شر پہنچتا ہے تو بے چین اور بے قرار ہو جاتا ہے اور واویلا کرنے لگ جاتا ہے۔ اس کے بعد بظاہر تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ جب اس کو خیر پہنچتی ہے تو پھر بڑی تسکین اور اپنے آپ کو امن میں سمجھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اب آئندہ مجھے کوئی شر پہنچے گا ہی نہیں۔ ایک اور موقع پر قرآن کریم نے یہ طرز بھی اختیار فرمائی ہے لیکن یہاں عملاً اس طرز کو بدل کر ایک اور رنگ میں بات کی گئی ہے۔ پس سوال یہ ہے کہ خیر کے ساتھ مَنُوْعًا کا ذکر کیوں کیا گیا اس لئے کہ مَنُوْعًا کا مطلب ہے کہ اپنی خیر دوسروں تک پہنچانے کا خیال

ترک کر دیتا ہے اور خسیس بن جاتا ہے۔ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی بھلائی میں دوسرے شریک ہو جائیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی پہلی حالت میں جو کیفیت بیان فرمائی گئی اس کی ذمہ داری اس دوسری آیت نے اس کی ذات پر ڈال دی۔ یعنی یہ کیسا انسان ہے جس کو دکھ پہنچتا ہے اور وہ دکھ کا احساس بھی کر لیتا ہے اور جانتا ہے کہ دکھ کیا ہوتا ہے۔ جب وہ اس دکھ سے نکلتا ہے تو اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ دوسروں کے دکھ دور کرے، نتیجہ تو یہ نکلنا چاہئے کہ وہ لوگوں کے ساتھ اپنے سکھ بانٹے اور جب بھی کہیں دکھ دیکھے تو وہ بے قرار ہو جائے لیکن یہ نہیں ہوتا بلکہ باوجود اس کہ وہ دکھوں میں صاحب تجربہ ہو چکا ہوتا ہے، باوجود اس کے کہ وہ جانتا ہے کہ مصیبت کیا ہوتی ہے پھر بھی جب وہ مصیبت سے نکلتا ہے خود غرض بن جاتا ہے اور دوسروں کی پرواہ نہیں کرتا اور قرآن کریم کے مطابق اس کی یہ کیفیت ایک فطری کیفیت ہے یعنی جس طرح ہر قسم کے جانور پیدا کئے گئے ہیں اور وہ یہی حرکتیں کرتے ہیں اس طرح انسان بھی جو مذہب سے نابلد ہو، جس کی مذہب نے تادیب نہ کی ہو اگر اس کو اس عام فطرت پر پاؤ گے تو اسی حالت میں دیکھو گے۔ چنانچہ دنیا کی جتنی بھی لامذہب قومیں ہیں ان کی یہی کیفیت بیان ہوئی ہے کیونکہ خدا نے ان کی تادیب نہیں کی، کسی مذہب نے انکی تہذیب نہیں کی، اس لئے ایسی قومیں جب بغیر الٰہی تعلیم کے عام فطری حالت میں پائی جائیں گی تو حیوانات کے زیادہ قریب ہوں گی یہ حیوانی فطرت ہے جس کا بیان کیا گیا ہے۔ وہ اپنے دکھ کے وقت تو خوب شور مچائیں گی اور کہیں گی کہ کون ہوتا ہے دنیا میں ہمیں مصیبت میں ڈالنے والا۔ چنانچہ آپ ان میں ایسی انانیت اور تکبر اور نفسا نفسی دیکھیں گے کہ جب دکھ پہنچتا ہے تو بے قرار اور مایوس ہو جاتے ہیں لیکن جب بھلائی آتی ہے تو بنی نوع انسان کو بھول جاتے ہیں اور یہ خیال بھی دل میں نہیں آتا کہ دوسرے لوگ بھی ہیں جو بیچارے مصیبت میں مبتلا ہیں کیوں نہ ہم ان کی بھی مصیبتیں دور کریں۔

چونکہ ان آیات میں ایک ایسی فطرت کا اظہار کیا گیا ہے جو انسان کی تخلیق میں ودیعت ہے اس لئے ظاہر ہے کہ انسان کا دماغ مایوسی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، یہاں پہنچ کر اللہ تعالیٰ انسان کو سنبھالتا ہے، اسے اپنا ہاتھ پکڑاتا ہے، دست نصرت عطا کرتا ہے اور فرماتا ہے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ نماز پڑھنے والے، عبادت کرنے والے مستثنیٰ ہیں۔ ان کی فطرتوں میں تبدیلیاں پیدا کی جاتی ہیں، ان کو نئے رنگ عطا ہوتے ہیں اور وہ برائیوں میں مبتلا نہیں ہوتے۔ جو

لوگ سچی نمازیں پڑھتے ہیں وہ جب دکھ محسوس کرتے ہیں تو دکھ ان پر غالب نہیں آتا، وہ جزع فزع نہیں کرتے، ان میں صبر کی بے مثال صفات پائی جاتی ہیں اور جب وہ خیر پاتے ہیں تو یہ نہیں سمجھتے کہ یہ ہمارا حق تھا جو ہمیں ملا ہے۔ گویا وہ یہ نہیں خیال کرتے کہ ہم خیر ہی کے لئے پیدا کئے گئے تھے اس وقت ان کو اپنے ان بھائیوں کا خیال آتا ہے جن کے دکھ میں سے تھوڑا سا حصہ انہوں نے بھی پایا تھا اور اپنے ان بھائیوں کی تکلیفوں کا بھی احساس ہوتا ہے جو بہت سی بھلائیوں سے محروم ہیں اور کئی قسم کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ان کے اموال میں غربا کا ایک معلوم اور مقرر حق ہوتا ہے۔ اس آیت کی اور بھی کئی تفاسیر ہیں لیکن ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اموال میں حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ مقرر کر بیٹھتے ہیں۔ جب مصیبت ان پر پڑتی ہے تو اس وقت وہ یہ عزم کر چکے ہوتے ہیں کہ آئندہ ہم اپنے دوسرے بھائیوں کے لئے خیر کا انتظام کریں گے اور خدا تعالیٰ جب ہمیں صبر عطا فرمائے گا تو ہم حق کے طور پر ایک حصہ مقرر کر لیں گے کہ اتنا ضرور اپنے بھائیوں کو عطا کرنا ہے۔ فرمایا لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ اور وہ مصیبتوں اور دکھوں سے اتنا عظیم الشان سبق حاصل کرتے ہیں کہ وہ صرف مانگنے والے کو نہیں دیتے بلکہ محروم کو بھی دیتے ہیں۔ یعنی ایسے شخص کی بھی مدد کرتے ہیں جو ہے تو محروم لیکن اپنی ضرورت ظاہر نہیں کرتا۔ یعنی صرف دنیا کے لحاظ سے محروم نہیں بلکہ اس بات سے بھی محروم ہے کہ سوال کرے، اس میں سوال کرنے کی استطاعت نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس کی فطرت میں اتنی غیرت رکھی ہے اور اتنی حیا اور شرم رکھ دی ہے کہ وہ سوال کرنے سے بھی محروم رہ جاتا ہے اس لئے جن لوگوں کو مال و دولت عطا کی ہے وہ یہ عزم کرتے ہیں کہ ہم ان لوگوں تک بھی پہنچیں گے جو اس نعمت سے محروم ہیں۔

یہ دراصل عبادت کا پھل ہے لیکن ساتھ ہی ایک چھوٹی سی شرط لگا دی۔ فرمایا یہ پھل اس عبادت کا ہے جس کو دوام حاصل ہوتا ہے۔ اسی لئے فرمایا الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ یہ نعمت ان لوگوں کو عطا ہوتی ہے اور یہ غیر معمولی شان اور عظیم الشان صفات حسنہ ان لوگوں کے حصہ میں آتی ہیں جن کی عبادت میں دوام ہوتا ہے عارضی عبادتیں کر کے اللہ سے چھٹی نہیں کر جاتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے دربار میں مستقلاً حاضر ہونے والے لوگ ہیں اور یہ دوام ہی دراصل اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ دو صفات پہلی دو صفات کے برعکس ان کو عطا ہوں۔ یعنی جب ان کو شر پہنچے تو وہ مایوس

نہ ہوں اور جزع فزع نہ کریں اور صبر کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں۔ اور جب ان کو خیر ملے تو اپنے تک محدود نہ رکھیں بلکہ غیروں تک پہنچائیں۔ یہ دو صفات حسنہ قرآن کریم کی رو سے عبادت کرنے والوں کے حصہ میں آتی ہیں لیکن ان عبادت کرنے والوں کے حصہ میں جو اپنی عبادتوں کو دوام بخشتے ہیں۔ یہ ان آیات کے مضمون کا خلاصہ ہے۔

ابھی ہم نے ایک نہایت ہی بابرکت رمضان کی لذت اٹھانے کی سعادت پائی ہے۔ اس مبارک مہینے میں جو لوگ پہلے عبادت نہیں کیا کرتے تھے ان میں سے بھی بکثرت ایسے تھے جنہوں نے عبادت شروع کر دی۔ وہ جو پہلے تنعم کی زندگی بسر کر رہے تھے انہوں نے محض للہ خود مشکلات برداشت کیں اور دیکھا کہ مشکل ہوتی کیا ہے، مصیبت کس کو کہتے ہیں؟ لیکن یہ مصیبت طوعی تھی، محض اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے برداشت کی گئی۔ چنانچہ انسانی نفس کی تربیت کا یہ سب سے بہتر موقع تھا۔ ایک مہینہ مسلسل ان پر یہ کیفیت طاری رہی کہ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ اور بڑی توجہ سے انہوں نے ان باتوں پر دوام اختیار کیا یعنی ایک مہینے کے دوران ان کو عبادت میں دوام نصیب ہوا اور ایک مہینے کی عبادت ایک اچھی خاصی موثر عبادت ہونی چاہئے۔ بعض عبادتیں ایسی ہیں کہ ان میں سے ایک عبادت ہی انسانی زندگی کا رنگ بدل دیتی ہے کجا یہ کہ ایک مہینہ مسلسل پانچ وقت عبادت کی جائے اور پھر رمضان کی سختی کا تجربہ بھی ہوا۔ رمضان سے وہی لوگ کامیابی کے ساتھ نکلے ہیں جو قرآن کریم کی ان آیات کے مطابق ان دو مقابل کی صفات کے حامل بن چکے ہیں جو جَزُوْعًا اور مَنُوْعًا کے مقابل پر اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی ہیں یا عطا فرمانے کا وعدہ کیا تھا۔

پس اگر انسان نے اپنے نفس میں یہ جانچنا ہو اور اس بات کا محاسبہ کرنا ہو کہ اس رمضان مبارک سے میں کیا پا کر نکلا ہوں اور کیا کھو کر نکلا ہوں تو یہ آیت ایک بہت ہی خوبصورت اور حسین پیمانہ اس کے سامنے رکھتی ہے۔ اگر رمضان مبارک کے بعد اس کی عبادات کو دوام حاصل ہو گیا ہے ایسا دوام کہ جو ایک مہینے کی حدیں پھلانگ کر بھی آگے جاری رہتا ہے، اگر رمضان مبارک کے بعد اس کو دکھوں کے احساس میں صبر کرنے کا سلیقہ آ گیا ہے، اگر کوئی دکھ اس کو مایوس نہیں کر سکتا، اگر رمضان مبارک کے بعد وہ پہلے سے زیادہ بنی نوع انسان کا ہمدرد بن چکا ہے تو اسے مبارک ہو کہ قرآن کریم کی یہ آیات اسے ہمیشگی کی فلاح کی خوشخبری دے رہی ہیں۔ اگر کوئی انسان ان سے عاری

گزرا ہے تو وہ اپنے نفس کا محاسبہ کر کے خود ہی جائزہ لے اور آئندہ اصلاح کی کوشش کرے۔ میں بار بار اس لئے کہہ رہا ہوں کہ دوست خود اپنے نفس کا محاسبہ کریں۔ ان کو اس بات کا حق نہیں دیا گیا کہ وہ دوسروں کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیں کہ تم اس رمضان سے گزرے ہو اور پھر بھی ویسے کے ویسے رہے ہو۔ اس سے آپ کو بھی نقصان پہنچے گا اور مخاطب کو بھی نقصان پہنچے گا۔ آپ کے اندر انانیت اور تکبر پیدا ہو جائے گا اور وہ یہ سمجھے گا کہ مجھے طعنے دیئے جا رہے ہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ پہلے سے بھی برے حال میں چلا جائے گا اس لئے یہ نصیحت کا طریق نہیں ہے۔ اس وقت اس منزل پر تو ہر شخص کو خود اپنے نفس میں ڈوب کر اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہئے۔

اب جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ یہ نمازیں کیا اثر پیدا کرتی ہے، مومن کے اندر کیسے دو صفات پیدا ہو جاتی ہیں جو بظاہر اس کی فطرت کے خلاف ہیں لیکن یہ ارتقائی صفات ہیں جو انسانی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں۔ ان میں ان صفات کی جڑیں پائی جاتی ہیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے لیکن ایک نیا اور بہتر پھل پیدا ہو جاتا ہے اور ایک نیا وجود گویا ظہور میں آجاتا ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟ اس کو میں بیان کرنا چاہتا تھا لیکن اگر چہ آج میں گرمی کی وجہ سے خطبہ کو بالکل مختصر کرنا چاہتا تھا پھر بھی بات لمبی ہوگئی ہے۔ قرآن کریم کی آیات کے مفہوم کو سمجھانے کے لئے اس لئے تفصیل سے بات کرنی پڑتی ہے کہ بہت سے دوست عربی نہیں جانتے، وہ قرآن کریم کو پڑھ تو لیتے ہیں لیکن مفہوم نہیں سمجھتے اس لئے ایسے دوستوں کا خیال کر کے ذرا تفصیل سے بات کرنی پڑتی ہے۔ بہر حال عبادت کا کیا تعلق ہے، وہ کیسے انسانی فطرت کی کمزوریوں کو دور کر کے ان کو خوبیوں میں بدل دیتی ہے یہ ہے وہ مضمون جس کے بارہ میں میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔

یہ کوئی دعویٰ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ایک گہری حقیقت اور ایک ٹھوس فلسفہ ہے۔ ایک ایسا شخص جو خدا کی عبادت کرتا ہے جب اس پر مصیبت نازل ہوتی ہے تو ایک رستہ اس کے لئے کھلا ہے اور وہ ہے دعا کے ذریعہ مصیبت کو دور کرنے کا رستہ۔ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کلیۃً بے بس اور کمزور انسان ہوں، میری کوئی پیش جا ہی نہیں سکتی اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ معاملہ حد سے اتنا گزر چکا ہے کہ ساری دنیا کے ڈاکٹرز اس مرض کو شفا نہیں بخش سکتے، ساری دنیا کے مسائل حل کرنے والے میری مصیبت کا کوئی حل تجویز نہیں کر سکتے۔ یہ احساس رکھتے ہوئے بھی وہ یہی سمجھتا ہے کہ میرا خدا

قادر مطلق ہے، وہ دعاؤں کو سننے والا ہے، وہ ناممکن کو ممکن میں بدل سکتا ہے تب وہ اس یقین کی بنا پر کسی حالت میں بھی مایوس نہیں ہوسکتا۔ یعنی جس قوم کو دعا پر کامل یقین ہو اور وہ سمجھتی ہو کہ دعا اور عبادت ایک ایسی قادر مطلق ہستی کے ساتھ میرا رابطہ قائم کر رہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے، جو ہر مشکل کو آسانی میں بدل سکتی ہے اور ہر دکھ کو سکھ میں تبدیل کر سکتی ہے، ایسا آدمی سوائے اس کے کہ پاگل ہو جائے وہ مایوس نہیں ہوسکتا اور یہاں پاگلوں کی بات ہی نہیں ہو رہی۔ عام انسان جو عبادت کا حق ادا کر رہا ہو اور عبادت کے مفہوم کو سمجھتا ہو اس کے لئے کسی وقت بھی مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔

اس کا دوسرا پہلو جزع فزع سے تعلق رکھتا ہے۔ مومن اس لئے اس حالت میں نہیں پڑتا کہ عبادت کے ذریعہ اس کا رب کریم سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور یہ تعلق اس کو اللہ کا پیار عطا کر دیتا ہے اور اللہ کی رضا پر راضی رہنا بھی سکھا دیتا ہے۔ گویا عبادت ایک مصیبت زدہ مومن کے لئے دوہری رحمت کا پیغام لاتی ہے۔ عبادت کے وقت جب وہ خدا سے مانگتا ہے تو اس شرط کے ساتھ نہیں مانگتا کہ اے خدا! مجھے دے نہیں تو میں تم سے روٹھ جاؤں گا۔ ایسی دعا تو انسان کے منہ پر ماردی جاتی ہے اور قبول نہیں ہوتی۔ مومن بندہ تو یہ عرض کرتا ہے کہ اے میرے اللہ! میری مشکلوں کو دور فرما، میرے دکھوں کو آسانیوں میں بدل دے، میں تجھ سے التجا کرتا ہوں میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور تجھ سے ہی مانگتا ہوں لیکن میری طرف سے کوئی دھمکی نہیں ہے، میری طرف سے کوئی زور نہیں ہے، تو مالک ہے اور میں تیرا بندہ اور غلام ہوں، تو عطا کر دے گا تو میں راضی رہوں گا، تو نہ عطا کرے گا تب بھی میں راضی رہوں گا یہ ایک طبعی نتیجہ ہے جو ایک معقول اور صاحب فہم انسان کی دعا کا نکلتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ دعا کے سوا انسان کے لئے اور کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ دعا کرنے والے ایک مومن اور ایک عام انسان کی مثال دی جائے تو ایسی بنتی ہے جیسے کہتے ہیں ایک نوکر اپنے مالک سے تنخواہ بڑھانے کا مطالبہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس بیچارے کو حوصلہ نہیں پڑتا تھا کیونکہ مالک بڑا جابر تھا۔ نوکر کہتا تھا میں اپنی تنخواہ بڑھوانا چاہتا ہوں لیکن کیا کروں میری کوئی پیش نہیں جاتی بہت ڈر لگتا ہے۔ کسی نے اس کو سمجھایا کہ اس طرح تنخواہ نہیں بڑھائی جائے گی۔ تم اپنی مونچھیں بڑھاؤ اور اپنے اندر ذرا رعب داب پیدا کرو اور پھر مونچھوں کو تیل لگا کر اور بل دے دے کر اونچا کرو اور پھر مالک کے پاس جا کر مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہنا آپ میری تنخواہ بڑھاتے ہیں کہ نہیں، بڑھائیں ورنہ۔۔! تو

اتنی سی بات سنکر ہی مالک ڈر جائے گا۔ اور تمہاری تنخواہ بڑھا دے گا۔ چنانچہ اس بیچارے نے مونچھیں پالیں، تیل ویل ملا اور بل دے دے کر انہیں اونچا بھی کیا۔ جب وہ مالک کے سامنے پہنچا اور مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اس نے کہا حضور والا! آپ میری تنخواہ بڑھاتے ہیں کہ نہیں ۔ بڑھائیں ورنہ ۔۔! تو مالک نے جو اس سے بھی زیادہ طاقتور تھا بڑے جلال سے کہا کیا بکواس کر رہے ہو، بتاؤ ورنہ کیا کرو گے۔ اس نے کہا ورنہ حضور میں مونچھ نیچی کرلوں گا اور جس طرح آپ فرمائیں گے راضی رہوں گا، اس کے سوا میری پیش ہی نہیں جاسکتی۔ مالک نے کہا بہت اچھا پھر تمہاری تنخواہ نہیں بڑھتی۔

پس اللہ سے مانگنے والے اس طرح تو مانگ نہیں سکتے اور اگر مانگیں گے تو لازماً مونچھیں نیچی کرنی پڑیں گی اس لئے معقول آدمی جانتا ہے کہ جہاں انسان کی کچھ پیش ہی نہیں جاسکتی، اپنی کچھ چل ہی نہیں سکتی وہاں سلیقے سے کیوں نہ بات کریں۔ مونچھ بڑھا کر بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے ہی کیوں نہ یہ عرض کریں کہ اے اللہ! ہم تیرے عاجز بندے ہیں، ہماری کوئی پیش نہیں جاتی، کوئی بس نہیں چلتا، ہم بالکل بے حیثیت اور ناکارہ لوگ ہیں ہمیں جو کچھ عطا ہوا ہے تو نے عطا کیا ہے۔ اب ہمیں فلاں چیز کی ضرورت ہے، یہ بھی عطا کر دے تو تیرا احسان ہے۔ تو ہمیں عطا نہیں کرے گا تب بھی ہم تیری ذات پر راضی رہیں گے۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو نہ عطا ہونے پر روٹھ جایا کرتے ہیں۔ روٹھنے کی جگہ بھی تو کوئی نہیں ہے۔ جائیں تو جائیں کہاں حضرت مصلح موعود فرماتے ہیں:

؎ میں ترا در چھوڑ کر جاؤں کہاں
چین دل آرام جاں پاؤں کہاں

اے خدا! ہم تیرا در چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور اگر چھوڑیں گے تو پہلے حال سے بھی بدتر ہو جائیں گے، جو کچھ میسر ہے یہ بھی نہیں رہے گا۔ اس دلی کیفیت سے جو دعا کر رہا ہو اس کے لئے جزع فزع کا کونسا موقع رہ جاتا ہے وہ تو مانگتے ہوئے خود اپنی حیثیت کو بھی پہچان رہا ہوتا ہے اور یہ عرض کر رہا ہوتا ہے کہ اے خدا! میں نے ہر حال میں راضی برضا رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت مصلح موعود نے ہی اس مضمون کو ایک اور شعر میں یوں بیان فرمایا ہے:

؎ ہو فضل تیرا یارب یا کوئی ابتلا ہو
راضی ہیں ہم اسی میں جس میں تیری رضا ہو (الفرقان اپریل ۱۹۷۷ء)

ہم تیرے عاجز بندے ہیں ہم ہمیشہ تجھ سے ہی یہ دعا کرتے رہیں گے کہ اے اللہ! ہمارے ابتلا دور فرما دے اور ہم پر فضل نازل فرما۔ لیکن اے ہمارے آقا! تو گواہ ہے کہ جب کبھی تو نے فضل نازل نہ فرمایا اور یہی فیصلہ فرمایا کہ ابتلا رہے گا تب بھی ہم تیری رضا پر راضی رہے۔

پس یہ عبادت ہی ہے جو انسان کی فطری کمزوری کو خوبیوں میں بدل دیتی ہے اس لئے مومن کے لئے جزع فزع کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں لیکن ساتھ ایک شرط لگا دی فرمایا اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ تمہاری ساری پرانی عبادتیں تو اس موقع پر کام نہیں آئیں گی۔ یہ تو انسان کی ایک مستقل حالت ہے۔ چونکہ انسان کے ساتھ مصیبتیں لگی رہتی ہیں اس لئے فرمایا تم اپنے آپ کو ایسی حالت میں نہ مبتلا کر دینا کہ تمہاری عبادتیں پیچھے رہ چکی ہیں اور مصیبتوں نے تمہیں آگے سے پکڑ لیا ہو۔ عبادتوں پر دوام اختیار کرنا تا کہ کسی حالت میں بھی تمہیں کوئی مصیبت اچانک نہ پکڑ سکے جب کبھی کوئی مصیبت آئے تو وہ دیکھ لے کہ ایک عبادت گزار بندے پر آئی ہوں اور عبادتیں ان مصیبتوں کو دھکے دے دے کر باہر نکال دیں اور تمہاری حفاظت کریں۔ چنانچہ قرآن کریم نے ایک اور موقع پر اسی مضمون کی وضاحت کے لئے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ (المومنون: ۱۰) کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ گویا مومن کو اس میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ اگر تم دنیا میں دوام چاہتے ہو تو عبادت کی حفاظت کرو، اگر تم اپنے امن اور سکون کے لئے دوام چاہتے ہو تو عبادت میں دوام اختیار کرو، اگر تم آسمانی حوادث سے محفوظ رہنا چاہتے ہو اور دکھوں اور مصیبتوں سے امن میں آنا چاہتے ہو تو عبادت کو اس کی شرائط کے ساتھ بجالاؤ تا کہ عبادت تمہارے لئے محافظ بن جائے۔

پس یہ وہ مضمون ہے جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے اور عبادت کا ذکر کر کے اس کا طبعی نتیجہ یہ نکالا وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وہ آدمی جو خدا سے مانگ رہا ہو اگر وہ خود دوسروں کو نہ دیتا ہو تو مانگنے کا اہل ہی نہیں رہتا۔ جو خدا سے یہ عرض کرنا چاہے کہ اے خدا! تو بڑا رحیم و کریم ہے تجھے سب کچھ حاصل ہے اس میں مجھے خیرات ڈال اور خود اس کی اپنی حالت یہ ہو کہ جب دوسروں کو ضرورت ہو تو خیرات نہ دیتا ہو تو اللہ تعالیٰ تو اس کی دعائیں نہیں سن سکتا اور ایک معقول اور صاحب فہم آدمی ایسی دعا کر ہی نہیں سکتا۔ جب اپنا حال یہ ہو کہ وہ دوسروں کے

لئے کنجوس بن چکا ہو وہ اللہ سے مانگنے کا حق ہی نہیں رکھتا۔ پس ایسے بندے جو اُولُوا الْاَلْبَابِ ہوتے ہیں وہ دعائیں کرنے سے پہلے پوری ذہنی تیاری کر چکے ہوتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ اے خدا! جو کچھ تو ہمیں دے گا ہم اکیلے نہیں کھائیں گے بلکہ ہم آگے تیرے بندوں کو بھی پہنچائیں گے اور تیری عطا میں ہم سارے حصہ رسدی شریک ہوں گے اس لئے اے خدا! میری خاطر نہیں تو اپنے دوسرے بندوں کی خاطر ہی عطا فرما اور مجھے اس کا ذریعہ بنا دے تا کہ مجھے بھی لطف آئے کہ میں آگے لوگوں میں تقسیم کر رہا ہوں۔ چنانچہ انبیاء کی فطرت میں یہ بات بدرجہ اولیٰ موجود ہوتی ہے۔ تبھی حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا تعالیٰ نے آسمان سے اترتا ہوا ایک نان دکھایا اور فرمایا یہ تیرے لئے اور تیرے ساتھ کے درویشوں کے لئے ہے۔ (تذکرہ: صفحہ ۱۴) یعنی یہ نہیں فرمایا کہ اپنے ساتھ کے درویشوں کو دو بلکہ فرمایا ہم تیری فطرت کو جانتے ہیں تو کوئی فیض اپنے لئے اکیلا رکھ ہی نہیں سکتا لازماً جو نعمتیں ہم تجھے عطا کرتے ہیں ان کو تو آگے بانٹ دیتا ہے اس لئے ہم پہلے ہی ان لوگوں کو شامل کر کے کہہ رہے ہیں کہ اے میرے بندے! یہ تیرے لئے اور تیرے ساتھ کے درویشوں کے لئے ہے۔

پس یہ سلیقہ بھی عبادتیں ہی سکھاتی ہیں کہ انسان اپنی بھلائیاں دوسروں میں تقسیم کرے اور اس تقسیم میں لذت پائے، دکھ محسوس نہ کرے بلکہ لطف اٹھائے اس لئے میں امید رکھتا ہوں کہ یہ رمضان جس نے ۲۹ دن بعض لوگوں کو عبادتیں سکھائیں اور جو پہلے ہی عبادت گزار بندے تھے ان کی عبادتوں میں اضافہ کیا، وہ ہمارے لئے یہ دائمی سبق پیچھے چھوڑ جائے گا کہ ہم اس یقین پر قائم رہیں کہ عبادت کے بغیر ہماری کوئی زندگی نہیں ہے، عبادت کے بغیر کسی مصیبت سے محفوظ رہنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے، عبادت کے بغیر ہم خدا کے وہ بندے نہیں بن سکتے جو بنی نوع انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور جیسا کہ ان آیات میں یہ ذکر بھی کیا گیا ہے عبادت کے بغیر ہم خدا کی طرف سے آنے والے عذابوں سے مامون و محفوظ نہیں رہ سکتے اس لئے اس سبق کو لے کر اپنی زندگی میں اپنائیں اور اسے اپنے اعمال میں داخل کریں اور پھر دیکھیں اللہ تعالیٰ کتنے بے انتہا فضل کرنے والا خدا ہے۔

(روزنامہ الفضل ربوہ ۳۰ / جولائی ۱۹۸۳ء)